محمد بلال

حیات امین احسن

(۲۰)

نئی نسل کی اصلاح و تربیت

کسی بھی قوم کے باشعور رہنما کی ایک پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ مستقبل پر نگاہ رکھتا ہے۔ وہ نئی نسل کی اصلاح و تربیت سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ امین احسن کے درج ذیل خطاب سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس درجے کے رہنما تھے:

''میں آپ کی اس ذرہ نوازی کے لیے شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی اس علمی مجلس میں مجھے تقریر کی دعوت دی۔ میں نے آپ کے نمائندوں سے معذرت کر دی تھی کہ میں کوئی تقریر نہیں کروں گا البتہ آپ کے تجویز کردہ عنوان پر کچھ متفرق باتیں طلبہ و طالبات کے سامنے عرض کر دوں گا۔ تقریر کا معاملہ یہ ہے کہ نوجوانی میں تو آدمی تقریر شوقیہ کرتا ہے، ادھیڑپن میں فرائض اور ذمہ داریوں کے تحت یہ کام کرنا پڑتا ہے لیکن بڑھاپے میں آ کر یہ چیز بوجھ بن جاتی ہے۔ میرا حال یہ ہے کہ میں جوانی میں بھی اس ذمہ داری سے گھبراتا رہا ہوں اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اب اس دور میں میرے لیے یہ کام کتنا مشکل بن گیا ہو گا۔

ہر قوم کے مستقبل کا انحصار اس کے نوجوانوں پر ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ دنیا کی عظیم سچائیوں میں سے ایک عظیم سچائی ہے۔ خواہ ہم اس کی قدر کریں یا نہ کریں۔ قومیں اپنے رقبوں، اپنی عمارتوں، اپنے باغوں اور چمنوں، اپنے دریاؤں اور پہاڑوں سے باقی نہیں رہتی ہیں بلکہ اپنی آئندہ نسلوں اور اپنے نوجوان سے باقی رہتی ہیں۔ نوجوان اچھے ہوں تو قوم زندہ رہے گی۔ اگر اس کے پاس دریا اور پہاڑ نہ ہوں گے تو وہ اپنے

لیے نئے دریا اور نئے پہاڑ پیدا کر لے گی۔ برعکس اس کے نوجوان مردہ ہوں تو اشبیلیہ، غرناطہ اور قرطبہ کی عظمتیں تعمیر کرنے والے بھی صرف تاریخ کی ایک داستان عبرت بن کے رہ جاتے ہیں! یہی نکتہ ہے کہ دنیا کی ہر زندہ رہنے والی قوم نے سب سے زیادہ اہمیت اپنے نوجوانوں کی اصلاح و تربیت کو دی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن قوموں کو یہ بات عزیز ہوتی ہے کہ صفحۂ عالم میں ان کا مادی وجود بھی قائم رہے اور ان کی معنوی ہستی بھی کارفرما رہے، انہوں نے اپنے بام و در کی آرائش کی بجائے اپنے آگے آنے والے اخلاف کی تہذیب و تربیت کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ میں تاریخ کا طالب علم نہیں ہوں لیکن سپارٹا کے لوگوں سے لے کر آج تک قابل ذکر قوموں کے جو حالات سرسری طور پر معلوم ہوئے ہیں، ان کی بنا پر یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ رومی و یونانی ہوں یا انگریز و امریکن، دنیا کے نقشے پر کوئی پائیدار نقش اسی قوم نے چھوڑا ہے جس نے اپنی آنے والی نسل کی فکر کی ہے۔ سپارٹا والوں کے متعلق میں نے کہیں پڑھا ہے کہ وہ اپنی عمارتوں میں کوئی تراشا ہوا پتھر لگانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ عمارتوں میں کوئی تراشے ہوئے پتھر لگانا قوم کے اندر تن آسانی اور تعیش پسندی کے رجحان کی دلیل ہے۔ اسی طرح اپنی آئندہ نسلوں کی صحت مندی کے معاملے میں، میں نے سنا ہے کہ وہ اس قدر حساس تھے کہ اس کے لیے انہوں نے بعض ظالمانہ طریقے بھی اختیار کر لیے تھے، مثلاً یہ کہ وہ کمزور بچوں کو سرے سے زندہ ہی نہیں رہنے دیتے تھے۔

ہمارے ہاں، یعنی اسلام میں، اولاد کی اصلاح و تربیت کا جو اہتمام رہا ہے اس کے لیے دوسری چیزوں سے قطع نظر کر کے اگر صرف قرآن ہی پر نظر ڈالیے تو اس کی اہمیت واضح کر دینے کے لیے وہ کافی ہے۔ حضرت ابراہیم کی وصیت اپنی اولاد کو حضرت اسحٰق و حضرت یعقوب کی وصیت و نصیحت اپنی ذریت کو، حضرت لقمان کی تلقین اپنے بیٹے کو۔ یہ ساری سرگذشتیں اسی لیے بیان ہوئی ہیں کہ ہم ان سے یہ سبق حاصل کریں کہ اچھے اسلاف کے نام اور کام اچھے اخلاق ہی سے باقی رہتے ہیں۔ حضرت نوح کی سرگذشت پڑھیے تو دل تڑپ تڑپ جاتا ہے کہ ان کو اپنے بیٹے کی نااہلی کا کتنا غم تھا اور انہوں نے اصلاح و تربیت کے لیے کیا کیا زحمتیں اٹھائیں اور کس کس طرح اپنے رب کے آگے آہ و فغاں کی۔ ماہنامہ میثاق لاہور۔ اپریل ۱۹۶۷ء" (مقالات اصلاحی ۳۶۵/۲)

دو کاموں کی اہمیت

کسی بھی قوم میں سیاسی اور سماجی سطح پر بہتری اسی وقت آتی ہے جب اس قوم میں فکری سطح پر اصلاحی کام کیا جائے۔ امین احسن اس نکتے سے پوری طرح واقف تھے۔ سردار محمد اجمل خان لغاری صاحب کے نام ایک خط

میں لاہور سے ۲۴؍ جنوری ۱۹۶۰ء کو انھوں نے لکھا:

''میرے سامنے جو دو کام ہیں وہ یہ ہیں:

ایک ایسے فکری و تربیتی مرکز کا قیام جو اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کے مقابلہ کے لیے بلند پایہ تصنیفات بھی تیار کرے اور اس مقصد کے لیے اشخاص کی تربیت بھی کرے۔

دوسرا ذہین اور سرگرم لوگوں کے ذریعہ سے جس حد تک بھی ممکن ہو معاشرے کو تباہی سے بچانے کی کوشش کرنا۔ ان دونوں کاموں کی ذمہ داری ہر اس مسلمان پر عائد ہوتی ہے جو صورت حال کا احساس رکھتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اگر صاحبِ جذب و تسخیر اشخاص اٹھیں تو ہماری خوش قسمتی ہے لیکن ان کا انتظار کر کے ہم اپنے فرض سے سبک دوش نہیں ہو سکتے۔

اس دوران میں جو خطوط مجھے موصول ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کاموں کے لئے وقت اور مال کی قربانی کرنے والے تو موجود ہیں لیکن سب اپنے اپنے مقامی میلانات کے تحت سوچ رہے ہیں جس کے سبب سے کوئی موثر کام نہیں ہو رہا ہے۔ اگر یہ قوتیں ایک بڑے کام کے لئے مجتمع ہو جائیں تو کچھ مفید اور موثر کام ہو سکتا ہے، میں نے فروری کے ''میثاق'' میں اس چیز کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے گا۔

میں درحقیقت موجودہ زمانے کی فاسد عقلیت کو بغیر چیلنج کئے جانے نہیں دینا چاہتا۔ اب یہ اللہ جانتا ہے کہ اس کام کے لئے میرے اندر صلاحیت ہے یا نہیں اور ہے تو کتنی ہے۔

میرے نزدیک یہ کام ضرور ہونا چاہیے اور منظم طور پر ہونا چاہیے، ورنہ ہمیں ڈوب مرنا چاہیے۔''

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۳۴)

افکار کے ضبط کی فکر

لاہور سے ۱۵؍ اگست ۱۹۸۵ء کو ملک عبدالرشید عراقی صاحب کے نام ایک خط میں امین احسن لکھتے ہیں:

''رمضان سے پہلے میں نے اصولِ تفسیر پر اپنے دس لیکچرز ریکارڈ کرائے ہیں ان میں پوری ایک کتاب کا مواد ہے اور ایسے اہم مباحث بھی ہیں جو تدبرِ قرآن کے مقدمہ میں نہیں آ سکے تھے۔ اب اس موضوع پر میرے تمام افکار ضبط میں آ گئے اور ان شاء اللہ اہلِ علم کے استفادہ کے لئے شائع ہو جائیں گے۔

اب اصولِ حدیث پر اپنے لیکچرز میں نے ریکارڈ کرانے شروع کر دیے ہیں۔ غالباً کل پندرہ لیکچرز اصولی مباحث پر ہوں گے۔ یہ اس لیے ریکارڈ کرا رہا ہوں کہ معلوم نہیں مجھے لکھنے کا موقع ملے نہ ملے افکار کا ضبط میں

آجانا ضروری ہے۔ اگر میں ان کو کتابی شکل میں نہ لا سکا تو شاید اللہ تعالیٰ دوسروں کو ان کے جمع و ترتیب کی توفیق بخشے۔ اب اگرچہ ہر سمت سے ایسی کتاب کے لیے مطالبہ ہو رہا ہے لیکن میری قوتِ کار اب کم ہو گئی ہے۔ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ جب تک زندہ رکھے اپنے دین کی کوئی چھوٹی موٹی خدمت لیتا رہے۔''

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۳۶)

ذہنی الجھنوں سے نبرد آزما مخاطب

امین احسن اندھی تقلید کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں کو پسند کرتے تھے جو غور و فکر کرتے ہیں، اگرچہ وہ الجھے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں۔ لاہور سے ۱۶/ فروری ۱۹۶۷ء کو محمود احمد لودھی صاحب کے نام ایک خط میں امین احسن لکھتے ہیں:

''خوشی ہوئی کہ آپ کی بیگم صاحبہ کو میرے بعض مضامین پسند آئے۔ خدا کرے تفسیر بھی پسند آئے۔ دوسری چیزیں بھی میری ان کو پڑھنے کو دیجیے۔ جو لوگ مجھے داد دیتے ہیں ان سے اس پہلو سے مجھے خوشی ہوتی ہے کہ ان کی سمجھ کے باب میں مجھے حسنِ ظن ہو جاتا ہے۔ آپ اس کو خود پسندی پر محمول نہ کیجئے گا۔ واقعہ یہی ہے کہ روشِ عام کے پیرو یا لکیر کے فقیر میری چیزیں پسند نہیں کر سکتے۔ صرف وہی لوگ پسند کرتے ہیں جو ذہنی الجھنوں سے نبرد آزما ہوئے ہوں۔'' (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۱۱)

فکر فراہی کی فکر

فراہی جو علمی کام ادھورے چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، امین احسن کو ان کی تکمیل کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی تھی، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

''ایک ملاقات میں کہا:

میں نے ایک دھیلا خرچ کیے بغیر وہ کام کر دیا جس کے لیے ڈاکٹر حفیظ اللہ نے پچاس ہزار کا عطیہ دیا تھا۔ اب انھیں مجھ سے یہ شکایت نہیں ہو سکتی کہ میں نے کچھ نہ کیا۔ اور روز حشر مجھ ان سے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔

اصلاحی صاحب کی یہ بات من وجہ صحیح ہے، لیکن مولانا فراہی کے اصل مسودات آج بھی کسی فرہاد کو ہکن کے منتظر ہیں۔

ایک موقع پر ''تدبر قرآن'' اور فکر فراہی پر دوسرے کاموں کا ذکر کرتے ہوئے اکیسویں صدی کے

حوالے سے کہا ''یہ فراہی کی صدی ہے۔''

''تدبر قرآن'' ہی کے پس منظر کو ذہن میں رکھ کر ایک ملاقات میں کہا:

جنھوں نے تفسیر ''تدبر قرآن'' پڑھی ہے وہ کہتے ہیں کہ آپ نے اپنی تمام محنت استاد کے کھاتے میں ڈال دی ہے۔

اصلاحی صاحب پانچ سال شب و روز فراہی کی صحبت میں رہے ہیں اور فراہی کی ایک ایک چیز کو پڑھ ڈالا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کے طالب علم ہی نہیں عالم ہیں۔ استاذ ہیں، امام ہیں۔ ان حالات میں اصلاحی صاحب کی زبان سے ذکر فراہی خوشی کی بات ہے:

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

لیکن موقع و محل اور سیاق و سباق کے لحاظ سے اصلاحی صاحب کا ایک پرانا خواب یہاں درج نہ کیا جائے تو شہادت حق کے منافی اور کتمان حق کے مترادف ہو گا خواب اگرچہ خواب ہی ہوتا ہے۔ ''اضغاث احلام'' لیکن کہتے ہیں بزرگوں کے خواب سچے ہوتے ہیں۔ پہلے خواب سن لیں۔ اصلاحی صاحب نے مجھ سے بیان کیا:

''مولانا فراہی کو کبھی کبھی خواب میں دیکھتا ہوں۔ حال ہی میں وہ مجھے خواب میں نظر آئے۔ ملاقات ہوئی تو فرمایا: میں جا رہا ہوں، میں نے دوسری جلد لے لی ہے، بکس خالد کو دے دو۔''

دوسری جلد سے ظاہر ہے مولانا اصلاحی کا اشارہ ''تدبر قرآن'' کی طرف تھا۔ خالد سے مراد خالد مسعود، مولانا اصلاحی کے ایک شاگرد ہیں۔ بکس کے بارے میں مولانا اصلاحی نے مجھ سے پوچھا کہ بکس سے مولانا کی کیا مراد رہی ہو گی۔ میں نے کہا کہ بکس سے مراد مسودات کا بکس ہو گا، اس کے علاوہ اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ اصلاحی صاحب نے کہا: ہاں ٹھیک ہے۔

جو لوگ خوابوں کے بارے میں جانتے ہیں۔ اور اس خواب کے محولہ امور کے بارے میں بھی معلومات رکھتے ہیں۔ وہ اس کی بہتر تشریح کر سکتے ہیں۔ یہ خواب دس بارہ سال پرانا ہے۔ اس کے بعد جوں جوں دن گزرتے گئے اصلاحی صاحب کے ذہن سے ماضی قریب بھی محو ہوتا گیا اور ماضی بعید بھی۔

بات خواب کی ہو یا بیداری کی ہمارے ساتھ ان کی گفتگوؤں میں زیادہ مدرسۃ الاصلاح، دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر، پھریہا، اعظم گڑھ، بمبھور اور مولانا فراہی کا تذکرہ ہوتا تھا۔ ایک دن میں گیا تو مولانا کو ہچکیاں آنے لگیں۔ کہنے لگے: میرے استاد کی موت ہچکیوں میں ہوئی تھی میں بھی اسی میں مروں گا۔'' (ذکر فراہی ۵۸۲)

تفسیر ''تدبر قرآن'' کے بارے میں سردار محمد اجمل خان لغاری صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں چاہتا ہوں کہ ایک جلد میری زندگی میں ضرور چھپ جائے تاکہ میری روح استاذ مرحوم سے شرمسار نہ ہو۔'' (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸)

قمر الدین اعظمی کانپور کے نام لاہور سے ۱۷ر مئی ۱۹۹۰ء کو خط میں امین احسن نے فراہی سیمینار میں اپنی شرکت کو شرعی فریضہ قرار دیا:

''آپ نے فراہی سیمینار کے موقع پر میری حاضری کو ضروری قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ ضروری ہی نہیں، بلکہ میرا شرعی فرض بھی تھا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ایک نوے سال کے بوڑھے کی ناتوانیوں کا اندازہ کر سکیں۔ میں اس معاملہ میں آپ لوگوں کو مجبور سمجھتا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب میں بھارت کا سفر تو درکنار لاہور کے اندر ہی کسی سفر سے بھی بالکل قاصر ہوں اگر کسی اہم ضرورت سے گھر سے نکلنا پڑتا ہے تو داہنے بائیں دو مددگاروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے اب میری حاضری کا خیال دل سے نکال دیجئے۔ ویسے امید ہے کہ یہاں سے بعض احباب جائیں گے اور ان کے ذریعہ سے میری نمائندگی ہو جائے گی۔ البتہ یہ ذمہ داری میں لیتا ہوں کہ میں برابر دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اس سیمینار کو ہر پہلو سے کامیاب بنائے۔ اب تک آپ نے طلبائے قدیم کی پرزور ترجمانی کی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اب اسی زور کے ساتھ میری ترجمانی کا فریضہ بھی ادا کریں گے۔'' (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۸)

خالد مسعود اور جاوید احمد غامدی کی حیثیت

خالد مسعود صاحب اور غامدی صاحب کا امین احسن کے ہاں کیا مقام تھا، اس کی وضاحت ایک گفتگو سے ہوتی ہے، جو امین احسن نے ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی کے ساتھ کی۔ ڈاکٹر ابو سفیان لکھتے ہیں:

''س۔ فراہی سیمینار کے لیے آپ کا پیغام ریکارڈ کرنا چاہتا ہوں؟

ج۔ ابھی سے پیغام ریکارڈ کر کے کیا کرو گے، جب یہاں سے لوگ جائیں گے میں انہیں کچھ نہ کچھ ریکارڈ کروا کے دے دوں گا اور اگر ہو سکا تو انہیں املا کرا دوں گا۔

س۔ فراہی سیمینار میں کن کن لوگوں کو یہاں سے بھیجیں گے؟

ج۔ دیکھو فراہیات کے سلسلے میں یہاں دو لوگوں کا خاص تعلق ہے: ایک خالد مسعود اور دوسرے جاوید الغامدی۔ ان دونوں کو میں نے تاکید کی ہے کہ وہ مقالات کے ساتھ سیمینار میں شریک ہوں۔ باقی ممکن ہے کہ کچھ اور لوگ بھی جائیں۔'' (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۷۵)

اہم ترین ساتھی

''تدبر قرآن'' کی تکمیل پر ریڈیو پاکستان نے ۲۳ / مارچ ۱۹۸۲ء کو لاہور میں امین احسن کا انٹرویو لیا۔ اس میں امین احسن نے اپنے اہم ترین ساتھیوں کا نام لیا۔

''سوال: وہ کون لوگ ہیں جن سے آپ کو توقع ہے؟

جواب: میرے ساتھیوں میں سے خالد مسعود صاحب ہیں، عبداللہ صاحب ہیں، جاوید احمد صاحب ہیں۔ اسی طرح اعظم گڑھ میں جو لوگ کام کر رہے ہیں ان میں مولانا بدر الدین صاحب ہیں۔ اب ان لوگوں سے میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ اس کام میں حصہ لیں۔'' (ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۱۲۴)

شاگردوں کی جستجو

علمی کاموں میں کسی صاحب علم کے بہترین ساتھی اس کے شاگرد ہوتے ہیں۔ یہ شاگرد ہی ہوتے ہیں جو استاد کے ادھورے کاموں کی تکمیل کرتے ہیں اور استاد کے مشن کے لیے تسلسل اور دوام کا باعث بنتے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں لاہور سے جناب محمود احمد لودھی کے نام امین احسن ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کے لاہور آنے کا آپ سے زیادہ میں طالب ہوں۔ استاذ مرحوم کو آخری دورِ زندگی میں سب سے زیادہ جستجو چند شاگردوں کی ہوئی تھی، یہی حال اس دور میں میرا ہے۔ انھی کی طرح میں بھی بہت کم لکھ سکا۔ پھر میرے پاس اپنی ہی نہیں بلکہ ان کی بھی امانت ہے۔ یہ تو اللہ کو علم ہے کہ اب کتنی مہلت باقی ہے، لیکن اب میں اپنی صحت کی طرف سے زیادہ پر امید نہیں ہوں۔'' (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۴۴)

شاگردوں کی تربیت اور حوصلہ افزائی

اچھے استاد کو صرف اپنے کاموں کی تکمیل ہی کی فکر نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنے شاگردوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ان کی نشوونما کے لیے بھی بے چین رہتا ہے۔ لاہور سے ۱۳ / فروری ۱۹۶۷ء کو جناب محمود احمد لودھی کے نام امین احسن ایک خط میں لکھتے ہیں:

''لکھنے کے معاملے میں اپنے شرمیلے پن کو خدارا اب دور کر دیجیے۔ اب اس کو طول دینے کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر آپ نے اس حجاب کو دور نہ کیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کی یہ صلاحیت جامد ہو کر رہ جائے گی اور یہ ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔ اس کے لیے میری دعا اسی وقت کارگر ہوگی جب آپ عملاً کچھ کریں گے اور کچھ

نہیں تو پہلے کچھ ترجمہ و تلخیص ہی کا کام شروع کیجئے۔ مولاناؒ کا کوئی مسودہ سامنے رکھ کر لکھئے یا جمہرہ (مراد امام فراہیؒ کی کتاب جمہرۃ البلاغہ ہے۔ مدیر) کو اردو میں کر ڈالیے مقصود آپ کے حجاب کو توڑنا ہے...

ادھر دو ہفتے طبیعت بجھی رہی۔ مجھ پر یہ دورے پڑتے رہتے ہیں۔ شکر گزار ہوں کہ آپ لوگ میرے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔''

اسی طرح ۲۷/فروری ۱۹۶۷ء کو لودھی صاحب کو خط میں کہتے ہیں:

''خوشی ہوئی کہ آپ نے لکھنے کے لیے اسلحہ سنبھال لیے ہیں۔ اصل میں جس سبب سے میں زیادہ زور دے رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کام میں جو جھجک ہوتی ہے اس کے دور ہونے کا یہی زمانہ ہے اگر آج یہ دور نہ ہوئی تو پھر اس کا دور ہونا بڑا مشکل ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی افادی حیثیت بہت محدود ہو کر رہ جائے گی۔ شہرت حاصل کرنے کی خواہش تو بے شک کوئی اچھی چیز نہیں ہے لیکن حصولِ کمال کی جدوجہد نہ صرف محمود ہے بلکہ ذی صلاحیت لوگوں کے لیے فرائض میں ہے۔ آپ اپنی ذہانت کی قدر کریں اور اس دور میں اس کی صحیح قدر کی شکل یہی ہے کہ قرآن کو اپنی فکر کا موضوع بنائیں اور اپنے فکر کو عمدہ اسلوب سے پیش کرنے کا سلیقہ پیدا کریں۔''

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۴۵)

لاہور سے ۱۳/مارچ ۱۹۸۶ء کو ایک خط میں لکھا:

''شانِ نزول اور احوالِ عرب کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شان نزول اور کلام کے موقع و محل کو خود کلام سے اخذ کرنے کی کوشش کیجئے۔ ایک اعلیٰ کلام اپنے پس منظر اور ماحول کو خود بہتر طریقہ پر واضح کر دیتا ہے۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز پڑھئے تو اونچے درجے کے ذی علم لوگوں کی چیز پڑھئے۔ گھٹیا قسم کے کتاب فروشوں کی چیزیں پڑھنے پر وقت صرف نہ کیجئے۔'' (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۳۱)

ذہنی تربیت کی غذا دیتے رہنا

مولانا وحید الدین خاں، امین احسن کے طرز تعلیم کا ایک انداز واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے زمانۂ تعلیم میں مولانا امین احسن اصلاحی مدرسۃ الاصلاح کے صدر مدرس تھے۔ تجربے کے مطابق مولانا موصوف ایک بہترین مدرس تھے۔ وہ اگر مدرسے میں مستقل قیام کرتے تو وہ زیادہ بڑا کام کر سکتے تھے۔ تقسیم ملک کے وقت وہ پاکستان چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ میرے نزدیک، مولانا موصوف کا مدرسۃ الاصلاح چھوڑ کر جانا کوئی درست فیصلہ نہ تھا۔ اگر وہ آخر وقت تک مدرسہ میں قیام کرتے تو

وہ تعمیرِ افراد کی صورت میں ملت کو زیادہ بڑا فائدہ پہنچا سکتے تھے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے اندر ایک خاص صفت تھی جو میں نے اپنے تجربے میں کسی اور استاد میں نہیں پائی، وہ ہے تدریس کے دوران ذہنی تربیت کی غذا دیتے رہنا۔ اس نوعیت کا ایک نمایاں واقعہ یہاں راقم الحروف کی کتاب ''دین و شریعت'' سے نقل کیا جاتا ہے:

''مدرسۃ الاصلاح میں قرآن خصوصی طور پر داخلِ نصاب تھا۔ یہاں مجھے یہ موقع ملا کہ میں مشہور عالمِ دین اور مفسر مولانا امین احسن اصلاحی (صاحب تدبر قرآن) سے براہِ راست قرآن کی تعلیم حاصل کروں۔ مولانا محترم اس مدرسے میں استادِ تفسیر بھی تھے اور صدر مدرس بھی۔ ایک روز درس قرآن کے تیسویں پارہ کی یہ آیت سامنے آئی:

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ۔[۱۴] (سورۃ الغاشیۃ: آیت ۱۷)

استاد محترم امین احسن اصلاحی نے اس موقع پر طلبہ سے سوال کیا کہ اونٹ کے سم پھٹے ہوتے ہیں یا جڑے ہوئے ہوتے ہیں، یعنی وہ بیل کی مانند ہوتے ہیں یا گھوڑے کی مانند۔ اس وقت ہماری جماعت میں تقریباً ۲۰ طالبِ علم تھے مگر کوئی بھی شخص یقین کے ساتھ اس کا جواب نہ دے سکا۔ ہر ایک اٹکل سے کبھی ایک جواب دیتا کبھی دوسرا جواب۔

اس کے بعد استاد محترم نے ایک تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے جوابات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم لوگ اونٹ کے سم کی نوعیت کے بارے میں نہیں جانتے۔ پھر انہوں نے عربی زبان کا یہ مقولہ سنایا: ''لا ادری نصف العلم'' (میں نہیں جانتا آدھا علم ہے) اس کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اگر تم لوگ یہ جانتے کہ تم اونٹ کے سم کے بارے میں بے خبر ہو تو گویا کہ اس معاملے میں تمہارے پاس آدھا علم موجود ہوتا۔ کیونکہ اپنی لاعلمی کو جاننے کے بعد تمہارے اندر یہ شوق پیدا ہوتا کہ تم اپنے علم کو مکمل کرنے کے لئے یہ معلوم کرو کہ اونٹ کے سم کیسے ہوتے ہیں۔ 'لا ادری' کا شعور تمہارے اندر بیدار ہوتا تو اونٹ پر نظر پڑتے ہی تم اس کے سم کو غور سے دیکھتے اور پھر تم اپنے نہ جاننے کو جاننا بنا لیتے۔

مدرسے کا یہ واقعہ میرے لئے اتنا موثر ثابت ہوا کہ یہ میرا عمومی مزاج بن گیا کہ میں ہر معاملے میں اپنی ناواقفیت کو جانوں، تاکہ میں اس کو واقفیت بنا سکوں۔'' (ماہنامہ الرسالہ، مئی ۲۰۰۹ء، ص ۳۸)

۱۴؎ ''کیا وہ اونٹوں پر نگاہ نہیں کرتے، وہ کیسے بنائے گئے ہیں۔''

ریاضت

امین احسن قرآن مجید کا مطالعہ ریاضت کے انداز میں کرتے اور اسی کی اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت کرتے۔ سلیم کیانی صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا قرآن پر تدبر میں پوری طرح منہمک رہتے۔ ان کے شاگردوں کو ان کی اس ریاضت سے بڑا فائدہ ہوتا۔ ان کی ہدایت یہ ہوتی ''ایک سورۃ کا اس وقت تک مطالعہ کیا کرو کہ جب تم اپنی آنکھیں بند کرو تو پوری سورۃ کا سراپا اس کے شروع سے آخر تک اپنے پورے جمال کے ساتھ تمھارے ذہن کے سامنے آجائے۔''

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۲۷)

[باقی]